حقیقت و اقسامِ شرک (۴)

بانئ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ..... امَّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ..... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

گزشتہ نشست میں ہم نے ''شرک فی الصفات'' کے ذیل میں دورِ جدید کے سب سے بڑے شرک یعنی ''شرک فی التوکل'' یا مادہ پرستی کے شرک پر گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ عرض کیا گیا تھا کہ انسان کا اولاً اپنی صلاحیتوں' اپنی قوتوں اور اپنی ذہانت پر اعتماد کہ میں نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے اور یہ میری صلاحیتوں کا ظہور اور میرے کام کا نتیجہ ہے' پھر جو کچھ بھی مادی اسباب و وسائل جمع ہوں ان پر انسان کا توکل اور بھروسہ کہ میں نے جو کچھ ساز و سامان اور اسباب و وسائل فراہم کر لیے ہیں ان سے یہ یہ نتائج لازماً نکل کر رہیں گے' انسان کی یہ ذہنی روش (mental attitude) اور اس کے سوچنے کا یہ انداز دراصل ''شرک فی التوکل'' ہے۔ اس ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲ اور سورۃ الکہف آیات ۲۳' ۲۴ کا حوالہ دیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع میں اس شرک کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت ہوئی ہے۔ اس میں دو اشخاص کا مکالمہ بڑی تفصیل سے نقل ہوا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمثیلی پیرایہ ہو۔ ان دو اشخاص میں سے ایک درویشِ خدامست تھا۔ اس کے پاس دنیاوی اسباب و وسائل اور مال و دولت نہیں تھی' لیکن اللہ پر اس کا کامل یقین اور توکل تھا۔ وہ معرفتِ خداوندی اور اللہ پر ایمان سے سرشار تھا' جبکہ دوسرا سرمایہ دارِ مال مست تھا۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَھُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِھِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰھُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَیْنَھُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْہُ شَیْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا ﴿۳۳﴾ وَّکَانَ لَہٗ ثَمَرٌ ج﴾

''اور (اے نبیؐ!) ان کے سامنے مثال بیان کیجیے دو اشخاص کی' ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور اُن کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ (یعنی پھل کے ساتھ ساتھ اجناس بھی پیدا ہو رہی تھیں) دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بارآور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی اور ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی (یعنی آب پاشی کا نظام بھی موجود تھا اور باغ کبھی سوکھا نہیں تھا)۔ مزید یہ کہ اس کا ثمر بھی تھا''۔ [اس سے یہ مراد بھی لی گئی ہے کہ وہ صاحب اولاد بھی تھا اور یہ بھی کہ باغ پھلوں سے لدا پھندا تھا]

﴿ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ ﴾

''پس اس نے اپنے ساتھی (درویشِ خدامست) سے کہا جو کہ اُس سے ہم کلام تھا (خیر اور بھلائی کی کوئی بات کر رہا تھا' کچھ خوفِ خدا دلا رہا تھا) کہ میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں''۔

یعنی اس کا دُنیوی مال و متاع اور اسباب و وسائل پر مکمل بھروسہ ہو گیا۔ آج کل کے زمانے میں یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے پاس دو بڑی بڑی ملیں (mills) ہوں اور اس نے ایک بڑا فارم بھی لگایا ہوا ہو۔ آب پاشی کے لیے بھی اس کا اپنا نظام ہو اور بجلی کے لیے واپڈا پر انحصار کرنے کے بجائے اس نے اپنا ہی دیو قامت جنریٹر لگا لیا ہو اور دو سال تک کے لیے ڈیزل بھی مہیا کر رکھا ہو' تو اُس شخص کے دل میں جو خناس پیدا ہو گا وہ اُس سرمایہ دارِ مال مست کے دل میں پیدا ہو گیا تھا' لہٰذا اُس درویشِ خدامست کے جواب میں اُس نے کہا: ''میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفری رکھتا ہوں۔'' تم خود تو جوتیاں چٹخارتے پھرتے ہو اور ہمیں آئے ہو نصیحت کرنے! ہمارے پاس یہ جو مال و متاع اور ساز و سامان ہے آخر یوں ہی تو نہیں ہمیں مل گیا! آخر ہمارے اندر کچھ ذہانت و فطانت ہے' ہم نے کچھ سوچا اور محنت کی ہے' تب ہی تو یہ چیزیں ہمیں حاصل ہوئی ہیں!

آگے فرمایا: ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ﴾ ''اور (یہ کہتے ہوئے) وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا''۔ جب اس نے باغ کا لہلہاتا ہوا منظر دیکھا تو اس کا نشہ دو آتشہ ہو گیا اور اس کے دل میں ایک خناس سا پیدا ہو گیا۔ ﴿قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ﴾ ''اس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی بھی تباہ ہو سکتا ہے' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی''۔ تم خواہ مخواہ مجھے خدا سے اور بُرے انجام سے ڈراتے ہو۔

دیکھئے یہ تھا وہ جہل مرکب جو اُس کے اندر پیدا ہوا۔ اس کے اعتقادات و نظریات میں کہیں بھی کسی دیوی دیوتا کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو اسباب و وسائل اور دُنیوی ساز و سامان کا ہے۔ اُس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ فلاں دیوی کا مجھ پر کرم ہے اور فلاں دیوتا کی مجھ پر کرپا ہے۔ بلکہ اس کے اگلے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ماننے والا ایک ربّ ہی کا ہے۔ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾﴾ ''تاہم اگر کبھی مجھے اپنے ربّ کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا''۔ جب میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں کہ مجھے یہاں اتنا کچھ ملا ہے تو وہاں اس سے بڑھ کر ملے گا۔ تم یہاں جوتیاں چٹخا رہے ہو تو وہاں بھی جوتیاں چٹخا رو گے۔ یہ ہے اس کا وہ خناس جو ظاہر ہوا۔

اب اُس بندۂ خدا کا جواب ملاحظہ فرمائیے: ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾﴾ ''اُس (درویشِ خدامست) نے اُس (سرمایہ دارِ مال مست) سے کہا جو اُس سے ہم کلام تھا کہ کیا تو نے کفر کیا اُس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے' پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھے ایک مکمل انسان بنا دیا؟'' ﴿لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾﴾ ''لیکن میرا ربّ تو وہی اللہ ہے (میں تو اس ایک ہی ربّ کا ماننے والا ہوں) اور میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ ﴿وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''اور (اے بد بخت!) یہ کیوں نہ ہوا کہ تو جب اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو کہتا جو کچھ اللہ چاہے (وہی ہو گا) کوئی زور نہیں (نہ میرا نہ کسی اور کا) مگر اللہ ہی کی توفیق و تائید سے''۔

یہ ''ماشاءاللہ'' کیا ہے؟ یہ کہ انسان کوئی سہانا منظر اور نعمت وغیرہ دیکھے اور سمجھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت کا ظہور ہے' اس کا کرم اور مہربانی ہے' اسی کی دین ہے' یہ میری قوتوں' میری صلاحیتوں اور میری توانائیوں کا ظہور نہیں ہے! یہ ہے اصل میں توحید کہ اگر آپ کہیں گھر میں داخل ہوں اور وہاں

آپ کو کوئی اچھا منظر نظر آئے' بچے کھیل رہے ہوں' گھر کے اندر خوشی کا ماحول ہو' ایک ہنستا بستا ہرا بھرا گھر ہو تو فوراً زبان سے نکلنا چاہیے ''ماشاء اللہ''۔ نگاہ کہیں اسباب و وسائل کی طرف منتقل نہ ہو جائے' بلکہ نگاہ کو ایک ہی زقند میں پہنچنا چاہیے مُسبّب الاسباب تک کہ وہ ہے جس کے فضل کا یہ ظہور ہے' یہ کسی اور کی کوئی مہارت' کاریگری' ہوشیاری اور کسی اور کی ذہانت و فطانت نہیں ہے۔

اس درویشِ خدامست نے پھر کہا: ﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾﴾ ''اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے' تو مجھے یقین ہے کہ میرا ربّ (اگر چاہے تو) مجھے تیرے باغ سے بہتر باغ عطا کر دے اور (تیرے) اس (باغ) پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے کہ وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے (جہاں خاک اڑ رہی ہو)۔ یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور تو (کسی طرح سے بھی) پانی کو کھینچ کر نہ لا سکے''۔

یہ وہ درویشِ خدامست کی بات تھی جو اُس کی زبان سے نکلی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ)) (۱) یعنی ''اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ پراگندہ بالوں والے ہوتے ہیں' دروازوں سے ان کو دھتکار دیا جاتا ہے' لیکن اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے''۔ اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ﴿وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ ''اور کھینچ لیا گیا (ختم کر دیا گیا) اس کا سارا ثمر''۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی وبا آئی ہو کہ ساری اولاد بھی ہلاک ہوگئی ہو اور کوئی ایک ایسا بگولا آیا ہو جو اُس کے پورے کے پورے باغ کو جھلسا کر چلا گیا ہو۔ ﴿فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِیْهَا وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ''اب وہ باغ پر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر اپنی ہتھیلیاں ملتا رہ گیا' جبکہ وہ اپنی ٹٹیوں پر الٹا پڑا ہوا تھا''۔ یعنی اس بات پر افسوس کہ میری ساری عمر کی محنت اور کمائی اس پر لگی ہوئی تھی اور یہ چشم زدن میں ختم ہوگئی۔ ﴿وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾﴾ ''اور وہ کہنے لگا کاش کہ میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا!''

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الضعفاء والخاملین۔ عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ۔

اب یہاں دیکھئے کہ یہ کون سا شرک مراد ہے؟ اس پورے واقعہ میں کسی بعل کا' کسی دیوی یا دیوتا کا اور کسی لات و منات اور عزیٰ کا کوئی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو ربّ کا ہے کہ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ﴾ ''اور اگر کبھی میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیا گیا.....'' یہ اصل میں مادے اور اسباب و وسائل پر توکل ہے' اپنی توانائیوں' ذہانت' دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کا گھمنڈ ہے جسے مذکورہ بالا رکوع میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مادہ پرستی کا شرک ہے جو پہلے شاید شاذ ہوتا ہو' لیکن آج کائناتی (universal) ہے۔ سائنس اسی بنیاد پر پروان چڑھی اور اُبھری ہے۔ یہ اس کائنات کے تمام مظاہر فطرت (phenomena) کو ایسے بیان کرتی ہے کہ یہ خودکار نظام ہے اور اس میں طبیعی قوانین عمل پیرا ہیں۔ مثلاً بھاپ اٹھی' ہوا اُسے اِدھر سے اُدھر لے گئی' بادل بنے اور بارش برسی۔ اس میں کہیں خدا کی مشیت' خدا کے ارادہ' خدا کے اِذن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ اگر خدا کا اقرار ہے بھی تو محض اس حد تک کہ وہ معاذ اللہ کسی کونے میں بیٹھ گیا ہے اور یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ ہمارا سارا توکل اور اعتماد مادی اسباب و وسائل پر ہے۔ اور اس شرک فی التوکل یا مادہ پرستی کے شرک میں کم و بیش ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔

اس کو ایک حدیث کے حوالے سے سمجھئے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ زُہد کی تعریف اس طرح بیان فرمائی کہ:

((اَلزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِیْ یَدَیِ اللّٰهِ)) (۱)

''دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال و دولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے' بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزهد عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔

یعنی تم عام طور پر سمجھتے ہو کہ حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا جائے تو یہ زہد ہے' یعنی نہ اچھا کھانا' نہ اچھا پہننا' حالانکہ اللہ نے یہ چیزیں حلال کی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ﴾ (الاعراف:۳۲)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں (ممنوع کر دیں)؟''

بلکہ زُہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا وثوق' اعتماد اور توکل زیادہ ہو جائے اس سے کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے' یعنی اسباب و وسائل اور دولت وغیرہ۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جیب میں پیسہ ہے تو دل کو سکون ہے' جیب میں پیسہ نہیں تو دل اڑا ہوا ہے' اس لیے کہ اللہ کے خزانوں پر' اللہ کی رزّاقیت اور قدرت پر ہمارا اتنا اعتماد اور یقین نہیں جتنا کہ پیسے پر ہے' بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اب اسے شرک کہہ لیں یا کفر کہہ لیں۔ جیسے ایک درویش نے کہا ہے: ''جو دم غافل سو دم کافر'' کہ انسان کا جو سانس غفلت میں بسر ہوتا ہے تو درحقیقت اس کا وہ وقت ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے۔ علامہ اقبال نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے توحید کی کتنی تلقین کی ہے! آپؐ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو تاکید فرمائی کہ اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ ''اگر تمام انسان مل کر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے حق میں لکھ دیا ہے' اور تمام انسان مل کر اگر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے خلاف لکھ دیا ہے۔''(۱) جب تک انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ تمام بیم و رجاء کا مرکز اللہ کی ذات ہو جائے' ماسوی اللہ سے امید اور خوف دونوں منقطع ہو جائیں تو گویا اصل توحید حاصل نہیں۔ توحید کا نام ہی تو ولایتِ خداوندی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (یونس) ''سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے یقیناً کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے''۔ ان کی امیدیں اور ان کا خوف سب ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ امید ہے تو اللہ سے اور خوف ہے تو اللہ سے۔ اُن کا ایمان اور یقین ہوتا ہے کہ کسی اور کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ کوئی میری بگڑی نہیں بنا سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے' کوئی میری تکلیف رفع نہیں کر سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ تو خوف اور امید دونوں جب تک جملہ مخلوقات سے منقطع ہو کر اللہ کی ذات سے منسلک نہ ہو جائیں انسان توحید کا لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ آج کا انسان اس مادہ پرستانہ فکر کی وجہ سے اس سے بہت محروم ہو چکا ہے۔ البتہ زبان سے لا الٰہ کہہ دینا آسان ہے' اس میں کوئی مشکل نہیں پڑتی۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع۔

بعض مذہبی نزاعات اوران کا حل

اب آیئے ذرا ''شرک فی الصفات'' کے کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرف کہ جن سے بعض مذہبی نزاعات رونما ہوئے ہیں۔شاید آپ کو ان کا کوئی حل میسر آ جائے۔صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور صفت بھی اور بطور اسماء بھی۔اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں بہت تھوڑا فرق ہے۔جب اُس لفظ کو حالت نکرہ میں لاتے ہیں تو وہ اللہ کی صفت ہے اور جب اسے معرّف باللاّم کرتے ہیں تو وہ اللہ کا نام ہے۔مثلاً ''سمیعٌ'' اللہ کی صفت ہے کہ اللہ سننے والا ہے' جبکہ ''السمیع'' اللہ کا نام ہے۔ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے اسماء وصفات ہی کے حوالے سے حاصل ہے۔جیسے ہم کہتے ہیں: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ'' کہ میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے۔تو ہمارا اللہ کے ساتھ جو ذہنی اور قلبی رشتہ ہے وہ اس کے اسماء وصفات کے حوالے سے ہے۔

قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے: ﴿لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى﴾ ''جتنے اچھے نام ہیں اسی کے ہیں''۔پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں جو نام آ گئے ہیں وہ تو یقیناً اللہ کے ہیں اور جن صفات کا اثبات ہو گیا ہے وہ اللہ کے لیے ثابت ہیں' لیکن چند صفات کو بنیادی قرار دیا گیا ہے کہ بقیہ صفات انہی کی فروع اور شاخیں (corollaries) ہیں۔مثلاً صفتِ علم اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے اور سمیع' بصیر' لطیف' خبیر' یہ تمام اصل میں علم ہی کے مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''قدرت'' ہے۔اب اس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام آ جائیں گے' مثلاً: اَلْمُعِزُّ ''عزت دینے والا' اَلْمُذِلُّ ''ذلیل کرنے والا' اَلرَّافِع ''اٹھانے والا' اَلْخَافِض ''گرانے والا' الباسِط ''کشادگی دینے والا' اَلقَابِض ''تنگی دینے والا'' یہ سب اس کی صفتِ قدرت ہی کی شروح اور اس کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات یہ ہیں (اگرچہ مختلف علماء' محققین اور متکلمین کے ہاں یہ مختلف ہیں): (۱) وجود[۱] (۲) حیات' (۳) قدرت' (۴) علم' (۵) ارادہ' (۶) کلام۔وہ الحیّ ہے' زندہ ہے' اس کا وجود حیات والا ہے۔وہ صاحب قدرت ہے' صاحب علم ہے' صاحب ارادہ ہے' متکلم ہے' کلام کرتا ہے۔اِن تمام صفات کے ساتھ جب آپ تین چیزیں جوڑ لیں گے کہ اس کی حیات مطلق ہے' اس کی حیات ذاتی ہے اور اس کی حیات قدیم ہے تو یہ توحید ہے۔اور اگر مطلق ہونے میں' قدیم ہونے میں اور ذاتی ہونے میں کسی اور کو کسی پہلو سے شامل کر لیا گیا تو یہ شرک ہے۔ماسوٰی اللہ کی حیات ذاتی نہیں عطائی (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) ہے' مطلق نہیں مقید اور محدود ہے' قدیم نہیں حادث ہے۔اگر یہ چیزیں پیشِ نظر رہیں تو توحید میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔لیکن اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو کسی ایک پہلو سے مجروح کر دیا گیا تو یہ شرک بن جائے گا۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی صفت ''وجود'' کے بارے میں علماء و محققین اور متکلمین کے ہاں ایک باریک سی بحث ہے کہ ''وجود'' صفت ہے یا نہیں۔

اب جان لیجیے کہ علم کے بارے میں توحید کیا ہے۔اللہ کا علم ذاتی ہے جبکہ ماسوٰی اللہ کا علم عطائی ہے۔ماسوٰی میں سب شامل ہیں۔جب فرشتوں سے کہا گیا کہ بتاؤ ذرا ان چیزوں کے نام تو اُن کا جواب تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط﴾ (البقرۃ:۳۲) ''تو پاک ہے (اے پروردگار!) ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا (عطا کیا) ہے''۔تو معلوم ہوا کہ فرشتے ہوں' انبیاء ہوں' رسول ہوں' اولیاء اللہ ہوں' کوئی بڑے سے بڑا اعلاّ مہ' فہّامہ ہو' کسے باشد' سب کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں' حادث ہے قدیم نہیں' محدود ہے مطلق اور لامتناہی نہیں۔یہ تینوں قیود اگر موجود ہیں تو شرک نہیں ہے' اور اگر ان میں سے ایک قید بھی ہٹ گئی تو شرک ہو جائے گا۔

مسئلۂ علم غیب

اب ذرا ''علم غیب'' کے مسئلے کو حل کر لیجیے! یہ ہمارے ہاں کے مُہتم بالشان مسائل میں سے ایک ہے اور اس میں بہت طویل بحثیں اور جھگڑے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو علمِ غیب حاصل ہے یا نہیں؟ ایک طرف سے اس کی پُر زور نفی ہے اور ایک طرف سے اثبات ہے کہ نبی اکرم ﷺ ''عالمُ الکُل'' اور ''عالم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' ہیں۔ اور اِن دونوں مکتب ہائے فکر میں جو رسہ کشی ہے وہ دراصل ''علم غیب'' کی تعریف (definition) کا اختلاف ہے۔ مجھ میں الحمدللہ معاملے کی تحقیق کا داعیہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اچھی طرح سے تحقیق کر لی جائے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر احسانات میں سے ایک احسان ہے۔ میں ابھی میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا کہ ساہیوال میں ایک بریلوی مکتب فکر کے عالم دین کے پاس گیا اور پوچھا کہ علم غیب کے بارے میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں آپ کا موقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے علم کے بارے میں یہ تینوں قیدیں مانتے ہیں کہ آپ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے' آپ کا علم قدیم نہیں حادث ہے' آپ کا علم غیر محدود نہیں محدود ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس پر اپنے مکتب فکر کے علماء کی تحریریں دکھائیں کہ ہماری طرف سے ان تینوں باتوں کا برملا اعتراف اور اقرار ہوتا ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ کم از کم ان تینوں چیزوں کو اگر تسلیم کیا جائے تو پھر میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور میرے نزدیک اس میں شرک والی بات نہیں ہے۔ تو دراصل اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ علم غیب کی definition مختلف ہو رہی ہے۔ جو اِس غیب کی نفی کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طریقے سے define کرتے ہیں اور جو غیب کا اثبات کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طرح سے define کرتے ہیں۔ جو اس کا اثبات کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں اور جو نفی کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں' لیکن ایک جھگڑا ہے کہ حل نہیں ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ''غیب'' کا لفظ کئی بار آیا ہے کہ ﴿عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ ''وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے'' تو یہ ہمارے اعتبار سے ہے۔ اللہ کے لیے تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ ہر شے آنِ واحد میں اس کے سامنے حاضر ہے۔ اس کے لیے غیب کا کیا سوال ہے! اللہ کے لیے اگر غیب کا تصور بھی آپ کریں گے تو کفر ہو جائے گا۔ جو چیزیں اللہ نے انسانوں کی نگاہ سے اوجھل رکھی ہیں وہ غیب ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر سارے حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں تو پھر امتحان کیسا! اگر جنت نگاہوں کے سامنے ہو' دوزخ بھڑکتی نظر آ رہی ہو اور فرشتے نگاہوں کے سامنے موجود ہوں تو کون فرعون' کون نمرود' کون ابوجہل ہوگا جو انکار کرے گا! وہ تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے اور پورے پورے مؤمن ہوں گے۔ اس لیے کہ غیب تو پھر شہادہ بن کر سامنے آ جائے گا۔ جبکہ امتحان تو اسی میں ہے کہ مانو ہمیں غیب میں رہتے ہوئے' مانو فرشتوں کو اِس کے باوجود کہ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں' مانو جنت اور دوزخ کو اس کے باوجود کہ وہ تمہارے لیے غیب ہیں۔ تو اس لفظ ''غیب'' کو اگر سمجھ لیا جائے تو جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

دراصل انسانوں کے علم کے آگے ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے اور علم کو شہادہ اور غیب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا کرتا ہے تو اسے اس غیب والے علم میں سے کچھ حصہ دیتا ہے' تبھی تو وہ نبی بنتا ہے! اگر اس کا علم بھی ہمارے علم کی طرح ہو تو وہ نبی کیسے ہو گیا! اسے تو جنت کی سیر کرائی جاتی ہے جو میرے اور آپ کے لیے غیبِ مطلق ہے۔ اسے دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جو ہمارے لیے غیب ہے۔ فرشتے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل مَلَکی شکل میں نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾﴾ (النجم)

''اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدرَۃ المنتہیٰ کے پاس اُس کو (جبرائیلؑ کو) اترتے دیکھا' جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سِدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

یہ مشاہدات عالمِ غیب کے ہیں نہ کہ عالمِ شہادہ کے۔ یہ جنت اور دوزخ کے مشاہدات ہیں' یہ عالم ملکوت کے پردے اٹھائے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.....﴾ (الانعام:۷۵)

''اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کراتے رہے.....''

تو معلوم ہوا کہ عام انسانوں کے لیے جو چیزیں غیب کے درجے میں ہوتی ہیں نبی کو اُن میں سے کچھ دیا جاتا ہے تب ہی وہ نبی بنتا ہے' ورنہ نبوت کا سوال ہی نہیں۔ اس کو قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے۔ سورۃ الجن میں فرمایا گیا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ.....﴾(الجن:۲۶'۲۷)

''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے.....''

البتہ ماسوی اللہ کے لیے کُل غیب کے احاطے کا اگر تصور بھی ہو گیا تب تو کفر بھی ہو گیا اور شرک بھی ہو گیا۔ کُل غیب تو دُور کی بات ہے' اگر کُل حاضر کا تصور بھی ذہن میں آ گیا تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

جس طرح ''شرک فی الذات'' کے ضمن میں قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۃ الاخلاص ہے' اسی طرح ''شرک فی الصفات' یا بالفاظِ دیگر ''توحید فی الصفات'' کے ذیل میں قرآن مجید کا عظیم ترین مقام آیت الکرسی ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی بھی شے کا' سوائے اس کے جو اللہ چاہے''۔ علمِ حاضر بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے' ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ آنکھ دیکھ رہی ہے تو اسے اللہ دکھا رہا ہے تو دیکھ رہی ہے' ورنہ آنکھ کے بس کا روگ نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ کان بھی سن رہے ہیں تو اللہ کے سنوانے سے سن رہے ہیں' ورنہ کانوں کا ذاتی وصف نہیں ہے کہ وہ سن سکیں۔ مخلوق کے ذاتی وصف اور صفت کا تو ہم نے انکار کر دیا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ذاتی وصف اور ذاتی صفت تو ہے ہی صرف اللہ کے لیے۔ لہٰذا علمِ حاضر کے جو ذرائع ہیں وہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ذاتی نہیں' عطائی ہیں اور اِن کا بھی اللہ تعالیٰ نے دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ آنکھ کی جو حد ہے اتنا ہی دیکھے گی اس سے آگے نہیں۔ البتہ خوردبین لگا کر کچھ مزید دیکھ لے گی' لیکن پھر خوردبین کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا علمِ حاضر ہو یا علمِ غیب' اگر ماسوی اللہ کے لیے کُل کا احاطہ کریں گے تو شرک ہو جائے گا' ورنہ نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہم انبیاء کے علم کو ناپیں اور تولیں تو اس سے بڑا پاگل پن اور اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو نوعیت کے اعتبار سے بھی ہمارے علم سے مختلف ہے۔ اسے ہم کیسے ناپیں گے! ہمارا علم تو علم بالحواس اور علم بالعقل ہے' جبکہ وہ علم' علم بالوحی ہے۔ لہٰذا جب حصولِ علم کے ذرائع اور مآخذ ہی مختلف ہوں اور ہم اپنے علم سے اُس علم کو ناپنے لگ جائیں تو اس سے بڑی حماقت اور اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کہ کسی شے کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دینا۔ اسے منطق میں ''قیاس مع الفارق'' کہتے ہیں کہ جو چیزیں بنیادی طور پر اور تقسیم کے اعتبار سے ہی مختلف ہوں آپ ان کو ایک دوسرے پر قیاس کریں اور ان کو ایک دوسرے کے پیمانوں سے ناپ

رہے ہوں۔ اور یہی ہے اصل مغالطہ۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم چاہا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دے دیا۔ ہم کون ہیں کہ ناپیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کو! جو یہ کہے گا کہ حضرت محمد ﷺ کا علم لامتناہی ہے' اور اللہ ہی کے علم کی طرح کامل اور کُل ہے وہ مشرک ہے۔ لیکن جو اِس کو اپنے تئیں ناپ تول کر بتائے گا کہ آپ ﷺ کا علم اتنا ہے تو وہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر کوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کا حدود اربعہ خود معین کرنے بیٹھ گیا ہے تو یہ بھی کم درجے کی گمراہی نہیں ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جو علم بھی تھا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا۔ انہیں جتنا دکھایا اللہ تعالیٰ نے دکھایا' جو بتایا اللہ تعالیٰ نے بتایا۔ آپ ﷺ نے کوئی غیب کی خبر دی تو اپنی ذات سے نہیں دی بلکہ اللہ کی بتائی ہوئی دی۔ جو لوگ انبیاء کے لیے علمِ غیب کی نفی کرتے ہیں وہ غیب کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ علم جو خود حاصل ہو وہ غیب ہے۔ جبکہ خود تو یہاں پر چھٹانک بھر علم بھی حاصل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ علم تو چاہے حاضر کا ہو چاہے غیب کا ہو وہ سب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ تو اصل میں یہ علم غیب کی تعریف ہی کا سارا فساد ہے کہ تم نے غلط تعریف کی ہے جس کی بنا پر غیب کی نفی کر رہے ہو۔ نہ تو یہ کسی حدیث نبویؐ سے منقول ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی کسی آیت سے منقول ہے۔ قرآن کے الفاظ تو یہ ہیں:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ.....﴾ (الجن:۲۶'۲۷)

''وہ عالم الغیب ہے' پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس کو پسند کر لے اپنے رسولوں میں سے.....''

چنانچہ یہ غیب کے پردے اللہ تعالیٰ اٹھاتا ہے صرف انبیاء و رُسل کے لیے۔ البتہ کتنے اٹھاتا ہے' کتنی اس کی مشیت ہے' کس کو کتنا دکھاتا ہے' یہ وہ جانے اور اس کا رسول جانے جس نے دیکھا۔

قرآن مجید میں سورۃ النجم میں شب معراج کا ذکر ہوا ہے کہ وہاں کیا دیکھا محمد ﷺ نے' تو اس میں ایک بہت اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ میں اور آپ کیا سمجھ سکیں گے کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا! اگر یہ بیان بھی کر دیا جائے تو ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا۔ لہٰذا قرآن مجید نے صرف یہ کہا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''انہوں نے دیکھا اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ سِدرَۃ المنتہیٰ پر کیا تھا' اگر قرآن اسے بیان بھی کرے تو ہماری سمجھ میں کیا آئے گا! لہٰذا صرف فرمایا گیا: ﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾﴾ ''جب کہ ڈھانپے ہوئے تھا اُس بیری کے درخت (سِدرہ) کو جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ تم کیا سمجھو گے' لہٰذا تمہیں کیا بتائیں کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا! بس تم اسی پر قناعت کرو کہ ''دیکھا (ہمارے بندے محمد ﷺ نے) اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ اس سے آگے تمہارے حاشیۂ خیال میں آنے والی بات نہیں۔ یہ ہے معاملہ ہمارے علم اور ہماری حدود کا اور ہم اس کو لے کر اپنے چلیں انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سید الانبیاء' سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے علم کو' تو یہ ہماری بنیادی غلطی اور بنیادی قصور ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ عالم الکُل ہیں' **عالمُ ما کان وما یکون** ہیں تو یہ عقیدے کی خرابی اور شرک ہے۔

اب ذرا ''مَا كَانَ وَمَا یَكُوْنُ'' کو بھی سمجھ لیجیے کہ کہنے والا اگر اس نیت سے کہہ رہا ہے کہ آپ ؐ کا علم ماضی پر بھی مشتمل ہے اور مستقبل پر بھی تو وہ غلط تو نہیں! اس لیے کہ ماضی کی بھی بہت سی خبریں نبی اکرم ﷺ کو دی گئیں اور مستقبل کی بھی بہت سی خبریں آپ ﷺ کو دی گئیں۔ جب تک کہنے والا اس احاطے کے ساتھ نہ کہے کہ کُل ماضی اور کُل مستقبل کا علم آپ ؐ کے پاس ہے' تب تک اس میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ صرف دو کیٹیگریز کے اعتبار سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن مجید کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ((فِیْهِ نَبَأُ مَا كَانَ قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ.....)) (۱) ''اس میں جو کچھ تم سے پہلے ہوا ہے اس کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے بعد ہونے والا ہے اس کی خبریں بھی ہیں''۔ تو قرآن میں اگر ماضی کی خبریں بھی ہیں اور مستقبل کے حالات کے بھی اشارے موجود ہیں تو آپ ﷺ کیا قرآن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ ماضی میں کیا ہوا اور مستقبل میں کیا

ہوگا؟ سارے فساد کی جڑ ہے تو وہ ایک لفظ ''کُل'' ہے۔ ''کُل'' اگر ماسوی اللہ کے لیے آ گیا تو یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی ہے۔ ''کُل'' کی شان تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ وہ ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ہے۔ ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ہے۔ یہ ''کُل'' کا لفظ اگر آپ کسی اور کے لیے لے آئے تو وہ گویا مطلق (absolute) ہو گیا جو کہ کفر و شرک ہے' حالانکہ absolute ذات صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ صرف ایک لفظی نزاع اور اصطلاح کا جھگڑا ہے' تعریف (definition) کا ٹکراؤ ہے' ورنہ اس میں کوئی بنیادی اختلافی مسئلہ موجود نہیں ہے۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

خالق اور مخلوق کے ارادہ و اختیار میں فرق و تفاوت

ذرا اور آگے چلیے! ارادہ ہم بھی کرتے ہیں اور ارادہ اللہ کا بھی ہے۔ لیکن وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ ہے کہ جو ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا ہے' جبکہ کسی اور کی یہ شان نہیں۔ سب کے ارادے اللہ کے ارادے کے تابع ہیں۔ اللہ کا ارادہ مطلق ہے' کسی کے تابع نہیں' اسے کہیں سے sanction اور منظوری نہیں لینی۔ ایسی بات نہیں کہ صدرِ امریکہ کوئی بل پاس کرانا چاہتا ہو لیکن پارلیمنٹ منظوری نہ دے اور اس کی جان مخمصے میں پھنس جائے۔ جیسے وقت کا فرعون جو خدائی کا مدعی تھا' اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرارداد (resolution) اپنے دربار میں پیش کی' لیکن درباری نہیں مانے تو فرعون کے ہاتھ بندھ گئے۔ یہ مطلق شان اللہ کی ہے کہ وہ جو ارادہ کر لے کر گزرنے والا ہے۔ مشیتِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ ''وہ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے''۔ ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ ''تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے''۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶) ''یقیناً (اے نبیؐ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں' لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ اُس کا اختیار مطلق ہے۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ چاہتا تو آنِ واحد میں ابوجہل کو ہدایت دے دیتا۔ ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ (المائدۃ:۱۸)

''وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے''۔ اگر وہ ابوجہل کو بخشنا چاہے تو اسے معاذ اللہ کون روکے گا! اور اگر وہ کسی بڑے سے بڑے نیک آدمی کو جہنم میں جھونکنا چاہے تو اس کا اختیار مطلق ہے' اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارے اور اہل تشیع کے مابین عقائد میں ایک بڑا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ ہم اللہ پر عدل واجب نہیں سمجھتے' جبکہ ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ پر عدل واجب ہے۔ ان کے نزدیک مجرم کو سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور بے گناہ کو سزا نہ دینا اس پر واجب ہے' جبکہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ مالک الملک ہے' مختارِ مطلق ہے' مشیتِ مطلقہ کا حامل ہے' وہ بڑے سے بڑے نیکوکار کو بھی جہنم میں جھونکنے میں بااختیار ہے۔ البتہ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جھونکے گا۔ امر واقع (De facto position) کوئی اور ہے' لیکن اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس لیے کہ جب کسی پر کوئی چیز واجب ہو گئی تو وہ مطلق شان تو نہ رہی! ہمارے نزدیک اللہ کی شان ہے ہی مطلق۔ اگر ہم اللہ پر عدل کو واجب مانیں تو وہ تو گویا ایک قانون کا پابند ہو گیا۔ حالانکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ اس نے جو قانون خود بنائے اس کا بھی پابند نہیں' جب چاہے انہیں توڑ دے۔ اس نے آگ میں جلانے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے' پانی میں سطح برقرار رکھنے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کر لے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین جب چاہے توڑ دے' وہ اپنی مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کرے' اس کا اختیار مطلق ہے۔ جبکہ ہمارے اختیار اور ہماری مشیت کی کیا حیثیت ہے؟ فرمایا گیا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر:۳۰) اس کے دو بڑے پیارے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ: ''اور

تمہارے چاہے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ نہ چاہے‘‘۔لیکن یہ تو ہے نتیجہ کے اعتبار سے‘ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محتاط ترجمانی ہے۔دوسرا ترجمہ ہے:’’اور تم چاہ بھی نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے‘‘۔تمہاری چاہت ہی اس کی مشیت کے تابع ہے۔یہ ہے اصل میں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت‘ کہ تمہاری مشیت بھی اس کی مشیت کے تابع ہے۔تم چاہ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ نہ چاہے۔یہ ہے اصل میں توحید کا وہ مقام کہ جہاں فنا ہو جاتا ہے انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے میں کہ پروردگار! جو تو چاہے بس وہی ہے‘ میں کیا چیز ہوں اور میری مشیت اور ارادے کی کیا حیثیت ہے! اس میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ سید المرسلین‘ محبوب ربّ العالمین حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے حوالے سے اگر دھوکہ ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پیش بندی کے طور پر فرما دیا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:٥٦)

’’یقیناً (اے نبیؐ!) آپ نہیں ہدایت دے سکتے جسے بھی آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘۔

اب اس تنبیہہ اور راہنمائی کے بعد کہاں شرک کا امکان باقی رہ سکتا ہے! قرآن مجید نے تو ایسے سب راستے مسدود کر دیے ہیں جن سے شرک در آ سکتا تھا۔اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ اندازِ تخاطب ہے ہی اس لیے کہ کہیں مغالطے کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو جائے‘ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ الحمد للہ یہ اُمت بحیثیت مجموعی شرک سے بچی ہوئی ہے۔

خدا اور انسان کی حیات کا تقابل

اب آیئے حیات کی طرف۔ہم بھی زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ ہے‘ لیکن ہماری زندگی اوّل تو یہ کہ اپنی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ع ’’لائی حیات آئے‘ قضا لے چلی چلے‘‘۔دوسرے یہ کہ اس حیات کا دارومدار اسباب پر ہے۔کھائیں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے‘ آکسیجن حاصل نہ رہے تو مر جائیں گے۔اگر پندرہ بیس دن مسلسل جاگیں تو موت واقع ہو جائے گی۔معلوم ہوا کہ یہ حیات بڑی ہی کمزور اور بے چاری ہے۔یہ بڑی ہی مجبور زندگی ہے جو دوسروں کے سہارے پر قائم ہے۔اس کے ساتھ ضعف اور احتیاج ہے‘ آرام اور نیند کی ضرورت ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ کی حیات کیا ہے؟ آیت الکرسی میں ہے:﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾(البقرۃ:٢٥٥) کہ اس کی زندگی تو وہ زندگی ہے جس میں نہ اونگھ ہے اور نہ نیند ہے۔اس کی قوتوں میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾﴾ (قٓ)

’’اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے‘ چھ دنوں میں پیدا کیے اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی‘‘۔

یعنی خالق کائنات کی زندگی کو اپنی زندگی کے مظاہر پر قیاس نہ کر بیٹھنا۔اُس کی زندگی اسباب اور سہاروں کے بل پر قائم نہیں‘ بلکہ قائم بالذات ہے‘ عطائی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔اب ذرا سوچیے کہ ہماری زندگی کو اُس کی زندگی کے مقابلے میں زندگی کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو صرف صورتِ حیات ہے‘ حیات نہیں ہے۔حیات تو صرف اللہ کے لیے ہے۔اسی طرح ہمارے پاس صرف صورتِ علم ہے‘ علم نہیں ہے۔العلم تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ہمارے اندر تو صرف ارادے کی ایک صورت ہے‘ حقیقتاً اور مطلقاً ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ہمارے اندر مشیت کی صرف ایک جھلک سی ہے‘ جبکہ اصل مشیت تو اللہ کی ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکالیے کہ مخلوقات کی جملہ صفات کو جب صفاتِ خالق کے مقابلے میں رکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ معدوم کے درجے میں ہیں‘ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ہمارے پاس کچھ علم ہے‘ لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں نہیں ہے۔ہمارے اندر حیات ہے‘ لیکن حیاتِ خداوندی کے مقابلے میں نہیں ہے۔اللہ کے مقابلے میں ہمیں کوئی قدرت‘ علم‘ مشیت حاصل نہیں ہے۔

میں اس اہم بحث کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قولِ مبارک سے سند پیش کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو دعائے استخارہ سکھائی۔ اور اس دعا کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ صحابہ کرام ؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیں یہ دعا اس طرح تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی کوئی سورۃ ہو۔ دعائے استخارہ کے الفاظ ہیں: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْاَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ.....)) (۱) ''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی بھیک مانگتا ہوں' اور تیری قدرت سے کچھ قدرت کی بھیک مانگتا ہوں اور میں تیرے فضل عظیم سے کچھ سوال کر رہا ہوں''۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ سورۃ القصص میں آئے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''اے میرے ربّ! تو جو بھی میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں''۔ مقامِ عبدیت تو یہی ہے کہ ﴿اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ﴾ (فاطر:۱۵) کہ تم ہر معاملے میں اللہ کے محتاج ہو۔ دعائے استخارہ کے مذکورہ بالا تین جملے مقامِ عبدیت کی وضاحت کے لیے بہت عظیم ہیں۔ اگلے دو جملے ہیں: ((فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ.....)) ''پس تجھے ہی قدرت حاصل ہے' مجھے کوئی قدرت نہیں' اور تو جانتا ہے مجھے کوئی علم حاصل نہیں۔'' اب اگر نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ کو اللہ تعالیٰ سے تقابل میں نہ رکھا جائے تو یہ نعوذ باللہ جھوٹ ہو جائے گا کہ ''مجھے کوئی قدرت اور علم حاصل نہیں'' جبکہ علم تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہے اور نبی اکرم ﷺ کا تو کہنا ہی کیا! اصل میں یہاں تقابل ہے کہ اے پروردگار! تیرے علم کے مقابلے میں میرا علم صفر ہے۔ تیری قدرت کے مقابلے میں میری قدرت صفر ہے۔ تو جب صفاتِ مخلوق کا صفاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تقابل ہوگا تو مخلوق کی صفات معدوم کے درجے میں شمار ہوں گی۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ سورۃ الکہف میں نقل ہوا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ ہمارے ایک بندے کے پاس جسے ہم نے علمِ لدُنی عطا فرمایا ہے' تو قرآن مجید میں تو اگرچہ یہ تفصیل موجود نہیں ہے لیکن روایات میں آتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے (اگرچہ ان کا نام قرآن میں نہیں ہے) حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ جو کشتی کے کنارے پر آ کر چڑیا بیٹھ گئی ہے اور اس نے سمندر میں چونچ ڈال کر پانی پیا ہے تو اس پانی کو کوئی نسبت ہے اس سمندر کے پانی سے؟ تو جان لو کہ کُل مخلوقات کے علم کو اللہ کے علم کے مقابلے میں یہ نسبت بھی حاصل نہیں۔

وجود باری تعالیٰ اور نظریۂ وحدت الوجود

اب ذرا نظریہ ''وحدت الوجود'' کی بحث کی طرف آیئے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے' قدیم ہے اور دائم ہے' جبکہ ماسوٰی کا وجود عطائی ہے' محدود ہے' حادث اور فانی ہے۔ گویا کہ وجود تو صرف اسی کا ہے' کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسوٰی سے وجود کی نفی ہے۔ یہ ''وحدت الوجود'' ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔ جو یہاں نہیں پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ میں ذرا یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ہمارے وہ صوفیائے کرام جو اگرچہ ''وحدت الوجود'' کے قائل ہیں' لیکن انہوں نے ''وحدت الوجود'' کو ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے ساتھ خلط مبحث (confuse) کر دیا ہے' مثلاً ابن عربی' مولانا روم اور دیگر نامور صوفیاء' ان کے بارے میں لوگ سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ تو انہیں بے محابا مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی طرف چلے گئے۔ دیکھئے نظریہ ''ہمہ اوست'' کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ اب ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ''ہمہ اوست'' کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہوگئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ لہٰذا اِس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور نعوذ باللہ خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقتِ وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسوٰی کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئے۔ اس لیے کہ ''ہمہ اوست'' میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ''وحدت الوجود'' میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔

لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہو گیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے بجائے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔

وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے، لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

کُلُّ ما فی الکون وھمٌ او خیال

او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے، یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اسے ایک اور مثال سے یوں واضح کیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا، بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار لیتی ہے۔ اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسویٰ کی نفی ہو گئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' میں صرف تعبیر کا فرق ہے، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔

اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے اوپر بھی تم ہو، اس کے نیچے بھی تم ہو، اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔ تو یہی نسبت خالق ومخلوق کے مابین ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج﴾ (الحدید:۳) ''وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے''۔ اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے، جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔ اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے، از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا، تم قیوم ہو اُس کے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے، اسے تھامے ہوئے ہے۔

آیت الکرسی میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان کے بعد الفاظ آئے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اس لیے کہ مسئلۂ شفاعت کا تعلق بھی صفات والی بحث سے ہے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO